© rasailojaraid.com

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر

از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ استاذ فلسفہ
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا یہ فاضلانہ مقالہ ہم کو محترم دوست مولانا فضل اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی وساطت سے برہان میں اشاعت کیلئے موصول ہوا ہے ہم اپنے دونوں کرمفرماؤں کے شکریہ کے ساتھ اسے شائع کرتے ہیں۔ (برہان)

مرید۔ اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر — میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر۔ "بال بازاں را سوئے سلطاں برد — بال زاغاں را بہ گورستاں برد" (بالِ جبریل)

میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر! آغازِ فکرِ انسانی سے یہی آواز بار بار مضطربانہ انداز سے بلند ہوتی رہی ہے لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہکر اس پر غور و فکر کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر اس مسئلہ میں جاذبیت کیا ہے؟ اس کے ذکر کے ساتھ ہی عامی سے عامی شخص تک کے کان کیوں کھڑے ہوجاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں، ہمارا سارا نظامِ دینیات، سیاسیات، تعلیمات، معاشیات، اور جرمیات اسی مسئلہ کے فہم و افہام پر مبنی نظر آتا ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو دینیات ہمیں سمجھائے کہ دوزخ ہمارا ٹھکانا کیوں ہو، جرمیات ہمیں بتائے کہ چور کو سزا دینے کے کیا معنے اور تعلیمات تزکیۂ اخلاق و تصفیۂ قلب پر اتنی مصر کیوں ہے؟ اگر ہم آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں تو پھر بقول اسپنوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر بھی اختیار نظر نہیں آتا؟ جذبات کا شور و شر ہنگامہ کیوں ہوتا ہے اور عقل شہوات کی غلام کیوں رہی ہے؟ آتشِ انتقام سے مشتعل ہوکر بچہ بھی تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دشمن پر آزادانہ حملہ کر رہا ہے، مدہوش شرابی کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکل رہا ہے اس میں اس کے اختیار اور مرضی کو پورا دخل ہے گو بعد میں پچھتاتا ہے کہ یہ بکواس اُسکی زبان سے نہ نکلی ہوتی! انسان اپنے کو آزاد و مختار اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے افعال کا تو شعور ہوتا ہے لیکن وہ ان اسباب و علل سے جاہل ہے جو ان افعال کا تعین کرتی ہیں۔" (اسپنوزا)

ہماری رائے میں اس قدیم مسئلے کے حل میں عقل نظری ناکامیاب رہی ہے۔ یہ مسئلہ اب بھی "لاینحل" ہے، یہ مسئلہ نہیں گتھی ہے! عقل کے اس عجز ہی کو دیکھکر پیغمبرِ اسلام (فداہ ابی و امی) نے فرمایا کہ

"اذا ذُکِرَ القدر فامسکوا" [1] جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہوجاؤ۔

یہ حکم ہوا عام کو، عالم اور خبیر سے فرمایا گیا۔

"لا تکلّموا فی القدر فانہ سِرُّ اللہ فلا تفشوا اللہ سرہ" [2] تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے پھر اللہ کے راز کا افشا نہ کرو۔

اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، جن کی شان میں فرمایا گیا ہے۔

لِمَن کان لہ قلبٌ او القی السمع وھو شہید جس کے پاس دل ہے اور کان لگایا اس حال میں کہ وہ خود حاضر ہے

اسلام کے سب سے بڑے صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

فسِرُّ القدر من اجلّ العلوم وما یفقہ سترِ قدر بزرگ ترین علوم سے ہے اور اس سے حق تعالیٰ سوائے

[1] طبرانی عن ابن مسعود کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی۔ [2] ابو نعیم فی الحلیۃ کذا فی [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ الا لمن اختصہ اللہ بالمعرفۃ التامۃ۔ ؎۱ اسکے کسی کو آگاہ نہیں کرتے جسکو انھوں نے معرفت تامہ کے ساتھ مختص کرلیا ہے"۔

ہم اقبالؔ سے "سرِ قدر" دریافت کررہے ہیں۔ اگر اقبالؔ محض شاعر ہوتے تو ہم بھلا اس فلسفیانہ گتھی کو ان سے سمجھنے کیوں جاتے؟ گو اس میں شک نہیں کہ بغوائے

ان من الشعر لحکمۃ ؎۲ بعض اشعار حکمت ہیں۔

علوم وحقائق شعراء کے ہاں بھی مل سکتے ہیں لیکن مسئلہ کی عظمت ہمیں ایک شاعر کے ہاں جانے سے روکتی۔ اگر اقبالؔ محض فلسفی ہوتے تو بھی ہم اس مسئلہ پر ان سے بحث کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں فلسفہ کی کھیتی پکتی نظر نہیں آتی۔ اقبالؔ علاوہ سحر بیان شاعر اور جید فلسفی ہونے کے ہمیں عارف بھی نظر آتے ہیں جن پر "صحبت پیر روم" نے بہت سے معارف کا دروازہ کھول دیا تھا مثلاً

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف (بالِ جبریل)

فلسفہ کی لم دلاسلّم سے اکتا کر انھوں نے اپنے مولیٰ سے معروضہ کیا تھا۔

خِرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں — میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر (۰)

وہ جان گئے تھے کہ

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں (۰)

؎۱ فصوص الحکم، شاہ مبارک علی ایڈیشن ص۱۳۰ فص عزیریہ۔ ؎۲ حدیث بخاری۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب انھیں حضور کی لذت حاصل ہونے لگی تو وہ اب عقلِ نظری کے استدلال سے متنفر نظر آتے ہیں اور "دانشِ برہانی" میں "عبرت کی فراوانی" کے سوا انھیں کچھ نہیں نظر آتا۔

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل (بالِ جبریل)

عارف کا مرتبہ و مقام اقبال اچھی طرح جانتے ہیں۔

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کیلئے لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے (〃)

اقبال کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ہم دریافت کر رہے ہیں کہ حدیثِ جبر و قدر کے متعلق ان کے پیر نے انھیں کیا سکھایا ہے؟ جواب میں اقبال کا پوزیشن اس شعر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے:

"چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است" (زبورِ عجم)

ظاہر ہے کہ اقبال مسئلہ کا صحیح حل وہی سمجھ رہے ہیں جو ان کے آقائے نامدار صلعم نے بیان کیا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی اور علمِ صحیح کی یافت اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ راستہ جبر و قدر کے درمیان اختیار کیا جائے۔

پہلے جبر کے پہلو پر نظر کیجئے۔ جس کسی کا خدا پر یقین ہے وہ خدا کو خالقِ افعال مانے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جس طرح خدا ہمارے جسموں اور روحوں کا خالق ہے وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے۔ یہ عقیدہ قرآن میں بصراحت النص پایا جاتا ہے، توجیہ تاویل کا امکان تک نہیں۔ ان شواہد پر غور کیجئے۔

اِنّا کُلَّ شیٍ خلقنٰہ بقدر ... ہم نے ہر چیز بنائی ہے پہلے ٹھہرا کر

وکُلُّ شیٍ فعلوہ فی الزبر[1] اور جو چیز انھوں نے کی لکھی ہے ورقوں میں

"شی" میں "افعال" بھی داخل ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ "خالقُ کلّ شی" ہیں لہٰذا یہ ضروری

[1] سورہ ۵۴ آیت ۴۹-۵۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پر لازم آتا ہے کہ وہ "افعال" کے بھی خالق ہیں۔ اگر افعال مخلوق نہ ہوتے (باوجود اس امر کے ان پر "ہر شی" کا اطلاق ہوتا ہے) تو پھر حق تعالیٰ بعض اشیاء کے خالق ہوتے اور بعض کے نہ ہوتے اور ان کا یہ قول کہ وہ "ہر شی" کے خالق" ہیں کذبِ محض ہوتا۔ تعالیٰ اللہ من ذلک علواً کبیراً۔

اس حجتِ قیاسی کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، قرآن میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ

واللہ خلقکم وما تعملون [1] — اور اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم کرتے ہو۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے افعال کے خالق ہیں۔ یہ تھا ایجابی طرزِ بیان ذرا سلبی طریقِ گفتگو پر بھی غور کر لیجئے۔

یہاں حق تعالیٰ اس امر سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے سوا کوئی خالق اور بھی ہے۔

اَم جعلوا للہ شرکآء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیٍٔ وھو الواحد القھار" [2] — کیا ٹھہرائے ہیں انھوں نے اللہ کیلئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش انکی نظر میں۔ کہہ اللہ ہی پیدا کرنیوالا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست

اب فرض کیجئے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان اپنے افعال پیدا کرتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ افعال افرادِ انسانیہ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان گنت افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ انسان کی پیدا کردہ چیزیں، جو خود خدا کی مخلوق ہے، اس خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ ہونگی جو انسان کا خالق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان قدرتِ تخلیق میں خدا سے بھی زیادہ کامل ہے اور اس کی مخلوق خدا کی مخلوق سے شمار میں کہیں زیادہ ہے۔ یہ عقیدہ تو صریحاً احمقانہ ہے۔ مخلوق خالق سے زیادہ قوی کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نتیجے کے طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ نہ صرف انسان کے

[1] سورہ والصافات آیت ۹۶۔ [2] سورہ الرعد آیت ۱۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خالق ہیں بلکہ اس کے افعال کے بھی" واللہ خلقکم وما تعملون" صرف حق تعالیٰ ہی خالق ہیں، فاعل ہیں، متصرف ہیں، لا فاعل فی الوجود الا اللہ۔ ساری کائنات ان کی مخلوق، انسان اور اس کے افعال سب کائنات میں شامل ہیں لہذا یہ سب ان کے مخلوق ہیں۔

جاوید نامہ میں اقبال اسی توحید فی الآثار و توحید فی الافعال کو بیان کر رہے ہیں۔

می شناسی طبع ادراک از کجاست؟ حورے اندر بنگہ خاک از کجاست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجاست؟ قوتِ ذکرِ کلیماں از کجاست؟
ایں دل وایں واردات از کیست؟ ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیِ گفتار داری؟ از تو نیست! شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تائید کلامِ نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

یارسول اللہ ارایت ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ اوامر نبتدأ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ، فقال عمر افلا نتکل وندع العمل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ" (صحاح)

یعنی جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اسکو شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہئے اور ترکِ عمل نہ کرنا چاہئے یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں مقرر و معین ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش و عمل سے کیا فائدہ؟ رسول اللہؐ نے فرمایا" کام کئے جاؤ ہر شخص کیلئے وہ آسان کر دیا گیا ہے جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"الآن طاب العمل" .... عمرؓ نے کہا" اور اپنے کام پر لگ گئے"

تقدیر کے بہانے سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ادائے فرائض میں اب ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کو تشویش و فکر سے نجات مل جاتی ہے۔ ہم جان لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے"

ایک اور دفعہ رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ

ارایت رقی نسترقیہا ودواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ تعالیٰ، یعنی جو افسوں کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟"

فقال انہ من قدر اللہ۔ [1] فرمایا کہ" یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے"۔

آپ کا یہ ارشاد تو اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہے کہ

لا یومن احد کم حتیٰ یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ [2] "یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس امر پہ ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے"۔

تعلیم اسلام میں جبر کا یہ پہلو صاف ہے اور اس سے صرف یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شئی کی تخلیق من اللہ ہے اور اقبال یہ کہہ کر

این ہمہ فیض از بہارِ فطرت است
فطرت از پروردگارِ فطرت است

"ہمہ از دوست" کے نظریہ کے قائل اور حامی نظر آرہے ہیں۔ لیکن جبر کی یہ ساری تعلیم قدر یا اختیار یا آزادی ارادہ کے منافی نہیں! بظاہر ہماری یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے، دو متضاد چیزوں میں تطبیق واقعی عجیب بات ہے۔ لیکن قرآن کا یہی اعجاز ہے۔ اور اقبال اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲ [2] صحاح ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید میں میرے پاس دلائل موجود ہیں۔ پہلے مجھے آزادیٔ ارادہ اور ذمہ داری کے نظریہ کی تشکیل کرنے دیجئے جو قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے "خلق من اللہ" کے دعوی کے ساتھ ساتھ قرآن میں انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس ظاہر التضاد کی وجہ سے آپ کو جو ضیق محسوس ہو رہا ہے اس پر ذرا سا صبر کر لیجئے ممکن ہے کہ اس مقالہ کے ختم پر آپ کو تسکین ہو جائے۔

انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے وہ اپنے افعال کا کاسب ہے اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے، اسی لئے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور وعید بھی کی ہے۔ چنانچہ قرآن میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ

"لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت" [1]

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے جس نے جو کیا اسکو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔

یہاں افعال کی ذمہ داری کا بار انسان پر رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے خیر کا کاسب ہے اور شر کو بھگتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فعلِ اخلاقی کا صحیح معنیٰ میں اسوقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ اگر ایک شخص سو رہا ہے یا اس کو دار وئے بیہوشی دی گئی ہے، یا وہ پاگل ہے۔ یا طفل شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنی کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اسکا فعل اختیار اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں اور جب قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ان احسنتم احسنتم لانفسکم و ان اساتم فلھا [2]

اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے۔

تو انسان کو اس کے اختیار اور عقلی ارادہ کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو

---

[1] البقرہ آیت ۲۸۶۔ [2]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام حسنؓ ظاہر فرماتے ہیں۔

"ان اللہ تعالیٰ لایطاع باکراہ ولا یعصی بغلبۃ ولم یھمل العباد من المملکۃ" — "اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجبر واکراہ نہیں ہورہی ہے اور نہ اس کی نافرمانی کسی قوتِ قاہرہ کی وجہ سے عمل میں آرہی ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اپنے ملک میں بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے۔"

"لا اکراہ فی الدین" قرآن کا دستور ہے۔ فعل کے ارتکاب میں جبر ہو تو وہ اخلاقی فعل کیسے کہلایا جاسکتا ہے؟ سہل بن عبداللہؒ کا ارشاد ہے کہ

"ان اللہ لا یقوی الابرار بالجبر وانما قوتھم بالیقین" — یعنی حق تعالیٰ نے نیکوں کو اطاعت کی قوت جبراً عطا نہیں کی ہے بلکہ انھیں یقین کے ذریعہ قوت دی ہے۔"

اس خصوص میں اکابر صوفیہ میں سے کسی کا یہ قول بمنزلہ قانون قرار دیا جاسکتا ہے۔

"من لم یومن بالقدر فقد کفر" — "جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے۔

ومن احال المعاصی علی اللہ فقد فجر" — اور جو معاصی کو خدا کے حوالہ کرتا ہے وہ فاجر ہے۔"

حق تعالیٰ کی نافرمانی کیلئے آزادیِ ارادہ کی ضرورت ہے اِن کی نافرمانی ممکن ہے اور جب بھی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے نافرمانی وقوع پذیر ہوتی ہے لہذا انسان کو انتخاب اور آزادی حاصل ہے جسکو وہ گناہوں کے ارتکاب کے وقت استعمال کرتا ہے۔ انسان کے اس اختیار کو، حریت کو، جبری آزادی کو اقبال بڑے جوش سے پیش کرتے ہیں ؎

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر — نہ ایں گنبد گرداں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب — کہ چوں پا واکنی جولانگہے ہست (پیام مشرق)

جاوید نامہ میں ایک نئے انداز سے کہتے ہیں ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارضیاں نقد خودی در باختند | نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بہ حرفے مضمر است | تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا | سنگ شو، بر شیشہ انداز د ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست | قلزمی؟ پابندگی تقدیر تست

اب ہمارے سامنے اثبات (Thesis.) اور نفی دونوں (Anti-Thesis.) صاف طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں۔ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے حق تعالیٰ انسان کے خالق ہیں اور اس کے افعال کے بھی خالق ہیں "خلقکم وما تعملون" بیان ہے۔ انسان اپنے اختیار و انتخاب میں آزاد ہے۔ اسی لئے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور اسلئے سزا و جزا کا مستحق ہے

من عمل صالحاً فلنفسہ | جو عمل صالح کرتا ہے اپنے نفس کیلئے کرتا ہے۔

نیز

افرأیتم ما تحرثون۔ | "تم دیکھتے نہیں کہ تم کیا بو رہے ہو یعنی جو بوؤ گے وہی کاٹو گے"

اس تضاد کو رفع کرنے کیلئے ہم آپ کو کچھ دیر کے واسطے تجرید فکری کی دعوت دیتے ہیں۔ تفکر بقول ہیگل کے کمزور دماغ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جسقدر کہ کمزور پشت کے واسطے بارِ گراں کا اٹھانا۔ دونوں مجبور ہیں اور اس لئے معذور۔ نہ ایک سے فکر ہو سکتی اور نہ دوسرے سے بوجھ اٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارا خطاب اہلِ فکر سے ہے۔ ان چند قضایا پر غور کیجئے ہمارا یہ تو یقین ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں اور وہ عالمِ مطلق بھی ہیں۔ اب عالم کیلئے 'علم' اور معلوم کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات میں ابتدا ہی سے صاف طور پر تمیز کی جا سکتی ہے وہ اپنے ہی افکار و تصورات کے عالم ہیں، یہی ان کے علم کے 'معلوم' ہیں، 'معروض' ہیں علم بغیر معلومات کے ویسے ہی محال ہے جیسے قدرت بغیر مقدورات کے، سمع بے مسموعات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بصر بے مبصرات کے۔ حق تعالیٰ چونکہ ازل سے عالم ہیں اور علم بغیر معلومات کے ناممکن، لہٰذا ان کی معلومات بھی ازلی ہیں۔ یعنی معلومات "غیر مجعول" یا غیر مخلوق ہیں۔ علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اس کا ان کی ذات سے انفکاک ناممکن ہے، ورنہ حق تم کو جہل لازم آئیگا۔ تعالی اللہ عن ذلک۔ چونکہ حق تعالیٰ غیر مخلوق اور ازلی ہیں۔ ان کا علم بھی غیر مخلوق ہے۔ اسی طرح چونکہ ان کا علم کامل ہے لہٰذا ان کے معلومات بھی کامل ہوں گے۔

اب حق تعالیٰ کے معلومات کو فلاسفہ "ماہیات اشیاء" کہتے ہیں اور صوفیہ "اعیانِ ثابتہ" (یا "صور علمیہ" یا "معلوماتِ حق" یا "حقائق الممکنات" یا "ازلِ ممکن") یہ، جیسا کہ کہا گیا، اولاً غیر مجعول ہیں اور ثانیاً کامل اور عدیم التغیر۔ ظاہر ہے کہ "عین" کی اپنی خصوصیت ہوگی جس کو اس کی فطرت کہا جاسکتا ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں "عین" کی "قابلیت" یا "اقتضا" یا قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے (قل کل یعمل علی شاکلتہ)

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اعیان چونکہ غیر مجعول و غیر متغیر ہیں لہٰذا ان کے اقتضاءات یا قابلیات و شاکلات بھی غیر مخلوق و عدیم التغیر ہیں ؎

قابلیت بہ جعل جاعل نیست فعل فاعل خلافِ قابل نیست

سرِ قدر کو سمجھنے کیلئے بس ان ہی چند قضایا کا سمجھکر تسلیم کر لینا کافی ہے۔ اور ہماری رائے میں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے آپ کو اختلاف ہوسکتا ہو۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ازل سے ثابت ہے۔ وہ ازل سے عالم بھی ہیں یعنی صفت علم سے موصوف ہیں۔ چونکہ علم کے لئے معلوم کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا معلوماتِ حق بھی ازلی ہیں اور غیر مجعول۔ معلومات ہی ماہیات اشیاء یا ذوات ممکنات کہلاتے ہیں۔ جب معلومات ازلی ہیں تو ان کی ساری قابلیات بھی ازلی ہوں گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب تخلیق کا تعلق ارادہ سے ہے۔ تخلیق ارادہ کا عمل ہے۔ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے علم کا تابع ہوتا ہے۔ ان کا ہر فعل تحت حکمت ہوتا ہے۔ اور اس کیلئے فعل کو علم کا تابع ہونا ضروری ہے تخلیق نام ہے حق تعالیٰ کے معلومات یا اعیان کے خارج میں انکشاف کا۔ جو چیز خارج میں منکشف ہو رہی ہے وہ بحیثیت تصور یا معلوم علم الٰہی میں ازل سے موجود ہے۔ ان ہی معلومات یا تصورات یا اعیان کا جب خارج میں تحقق ہوتا ہے تو ان کا نام اشیاء ہوتا ہے۔ اشیاء داخلاً معلوم ہیں، خارجاً مخلوق ہیں۔ اپنی انفرادیت اور تعین و تشخص کے لحاظ سے غیر ذاتِ حق ہیں۔ ذات حق تمام تعینات و تشخصات سے منزہ ہے، لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر!

اب ان حقائق کی روشنی میں حدیثِ جبر و قدر پر نظر ڈالو۔ تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن اشیاء کے اقتضاءات یا قابلیات کے مطابق ہو رہی ہے۔ اشیاء کی یہ قابلیات بے جعلِ جاعل ہیں یعنی غیر مخلوق و ازلی ہیں، ان کو کسی نے مجعول نہیں کیا۔ یہ اپنے اقتضاءِ ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہیں نہ کہ مجبور۔ یہی باریک بات جبری کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ اپنے میں یا ذات کو بھی مجعول و مخلوق خیال کرتا ہے یا اپنی خصوصیات و قابلیات کو بھی آفریدہ سمجھتا ہے، حالانکہ یہ معلومِ الٰہی ہونیکی وجہ سے ازلی ہیں، اگر یہ ازلی نہ ہوں، اور بہ جعل جاعل مجعول ہوں تو ضروری ہوگا کہ قبل جعل سلب ہوں گے، جو چیز سلب ہو وہ ہمیشہ سلب ہوگی موجود نہیں ہو سکتی، ورنہ قلبِ حقیقت لازم آئیگا اور یہ محال و باطل ہے۔ اگر جبری اس نکتہ کو سمجھ لے تو وہ پھر یہ نہ کہیگا کہ میری فطرت اس طرح کیوں بنائی گئی۔ فطرت جسکو ہم اصطلاحی الفاظ میں عینِ ثابتہ یا معلوم کہہ رہے ہیں بنائی نہیں گئی، وہ مجعول ہی نہیں یہ اور اس کے تمام اقتضاءات و قابلیات بے جعل جاعل ہیں اور اس طرح وہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہے۔ لیکن ان قابلیات و خصوصیات کو حق تعالیٰ خارج میں ظاہر کر رہے ہیں، وجود بخشی ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تخلیق ہمیشہ اللہ ہی کا فعل ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"خلقکم وما تعملون"

اوپر جو کچھ کہا گیا اس کو ایک جملہ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی سرِّ قدر ہے۔

لا یمکن بعین ان یظھر فی الوجود ذاتاً وصفةً وفعلاً الا بقدر خصوصیتہ واھلیتہ واستعدادہ الذاتی۔ (شیخ اکبر)

یہاں جبر و قدر دونوں میں تطبیق ہو رہی ہے۔ اعیانِ ثابتہ جو معلوماتِ حق ہیں (اور حق تعالیٰ ان کے عالم ہیں) اپنی خصوصیات قابلیات و استعدادات کے موافق ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ اختیار اور آزادی کا پہلو لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ سے ہو رہا ہے، یہ ہے جبر کا پہلو

دیکھو "حرکت ایک ہے اور نسبت دو"

ایک نسبت حق کی جانب ہے۔ یہ نسبتِ تخلیق ہے جملہ افعال کی تخلیق حق تعالیٰ کر رہے ہیں۔ فاعل حقیقی وہی ہیں۔ ذات خلق میں نہ حرکت ہے نہ قوت، "لاحول (یعنی حرکت) ولا قوۃ الا باللہ"۔ تخلیقِ افعال میں انسان مجبور ہے "ہمہ از وست"

دوسری نسبت خلق کی جانب ہے، یہ نسبتِ "کسب" ہے۔ یعنی افعال کی تخلیق عینِ ثابتہ یا ماہیت شئی کے بالکل مطابق ہو رہی ہے، بالفاظ دیگر جو کچھ عین میں ہے بہ فعلیت خالق وہی ظاہر ہو رہا ہے، یا یوں کہو ہر شئے کی فطرت کے مطابق ظہور ہو رہا ہے۔ جب تمام وقوعات میری اقتضا کے موافق ہو رہے ہیں اور کوئی شے میری فطرت کے خلاف مجھ پر عائد نہیں کی جا رہی ہے تو پھر میں صحیح معنی میں آزاد ہوں۔ اسی لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

"ما یحکم علینا الا بنا بل نحن نحکم علینا بنا"

جو کچھ ہم پر حکم لگایا جا رہا ہے وہ ہماری ہی فطرت کے مطابق ہے بلکہ خود ہم اپنی ہی اقتضا کے مطابق حکم لگا رہے ہیں۔

یہ ٹھیک قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ہے۔

اتاکم من کل ما سألتموہ (پ ۱۳ ع ۱۷)

یعنی وہ سب کچھ تم کو اُس نے دیا جس کو تمہارے عین نے لسانِ استعداد سے مانگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری جگہ اور زیادہ صاف طور پر بیان کیا گیا ہے۔

"انا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص"[۱] "ہم ان کا حصہ پوری طرح بغیر کسی نقصان کے دیتے ہیں"

"فللہ الحجۃ البالغۃ"[۲]

صاحبِ گلشن راز حق تعالیٰ کی زبانی کہلواتے ہیں ؎

ہرچہ از زین و شین شما است — بر سرِ اقتضائے عینِ شما است
ہرچہ عینِ شما تقاضا کرد — جودِ فیض من آں ہویدا کرد

ہر شخص کا عین گویا ایک کتاب ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات و قابلیاتِ ذاتیہ درج ہیں۔ حق تعالیٰ کی تخلیق اس کے عین مطابق ہو رہی ہے۔ جامیؒ سامی نے اس کو بڑی خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

"اے عین تو نسخۂ کتابِ اوّل — مشروع ذراں صحیفۂ اسرارِ ازل
احکامِ قضا چو بود در وے بدرج — حق کرد با حکامِ کتابِ تو عمل

اسی مفہوم کو اور زیادہ اصطلاحی زبان میں ادا کرو تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور تمام مسئلہ کی تلخیص حاصل ہو جاتی ہے۔ اعیان یا ماہیات در اصل معلوماتِ حق ہیں اور حق تعالیٰ کا حکم اپنے معلومات کا تابع ہوگا فللہ درّ من قال ؎

حق عالم و اعیانِ خلائق معلوم — معلوم بود حاکم و عالم محکوم
بر موجب حکم تو کند با تو عمل — گر تو مثل معذّبی در مرحوم (جامی)

اسی طرح حکمِ قدر عینِ ثابتہ کی طرف ہی رجوع ہوتا ہے یعنی تخلیقِ حق تابع اقتضاآت عینِ ثابتہ ہے، اسی لئے کہا گیا ہے "القدر انتونا لحکم لت" اب اس راز کے معلوم ہو جانیکے

۱؎ پ ۱۲ ع ۹ ۔ ۲؎ پ ۸ ع ۵ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد ہمیں ایک سکون حاصل ہوجاتا ہے اور ضمیر کے تعلق سے ہم کٹ جاتے ہیں۔ خیر و شر کا مبدء اپنی ہی ذات کو قرار دیتے ہیں" از ماست کہ برماست" کے معنی ہم پر کھل جاتے ہیں، نہ ظلم کی نسبت خدائے تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔ کیونکہ "ظلم باشد ز فعل او مسلوب"

انّ اللہ لیس بظلّام للعبید ۵ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں ہیں

نہ ابنائے زمانہ ہی کو ملعون و مطعون قرار دیتے ہیں اور نہ ماحول ہی کو بدنام کرتے ہیں، بلکہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتے ہیں اور اپنے ہی نفس کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

"یداک کسبتا و فواک نفخ" "تیرے ہی دونوں ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے" سچ ہے:

"وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم" تم پر جو مصیبت بھی پڑی ہے وہ تمہارے ہاتھوں ہی کی کمائی ہوئی ہے

جبر و قدر کی اس تلفیق کے بعد جب ہم علامہ اقبال کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی حل ہمیں ملتا ہے، لیکن طرز بیان مختلف ہے اور اصطلاحات جدا ہیں۔ مگر تضاد اس شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور توضیح میں اسقدر اجمال سے کام لیا گیا ہے کہ تضاد بیانی تو نمایاں نظر آتی ہے لیکن تلفیق کا نشان غائب ہوجاتا ہے۔ ان کی فلسفیانہ کتاب . . . (Reconst) میں ہمیں دو ایک عبارتیں ایسی واضح مل جاتی ہیں کہ اگر اقبال ان کی توضیح میں ذرا اور تفصیل سے کام لیتے تو بات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوجاتی۔ تاہم اقبال علم صحیح کے مطابق حل ضرور پیش کرتے ہیں، گو اجمالی طور پر۔ اسی اجمال کو یہاں کسیقدر کھولا جارہا ہے۔ اپنی مذکورہ بالا کتاب میں "تقدیر" کی توضیح میں اقبال کہتے ہیں۔

لے پ ۴ ۱۰۶۔ سے پ ۲۵ ع ۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

As the Quran Says.

"God treated all things and assigned to each its destiny. The destiny of a thing, men, at an unrelenting fate working from without like a taskmaster it is the inward reach of a thing, its realizable possibilities which lie within the depths of its nature, and Serially actuating themselves without any feeling of external Compulsion." (Ibid pp. 67-68.)

یعنی جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَقَدَّرَہٗ تَقْدِیراً۔" تقدیر کوئی قوتِ قاہرہ نہیں جو خارج سے شی پر بجبر عمل کر رہی ہو۔ بلکہ وہ خوشی کی باطنی رسائی ہے۔ اس کے وہ قابلِ تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں جو بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

اسی ایک عبارت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اقبال شے کی قابلیات اور اقتضاآت کو یا ان کے الفاظ میں "قابلِ تحقق امکانات" ہی کو اُسکا "اختیار" قرار دے رہے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتضاآت غیر مجعول و غیر مخلوق ہیں اور چونکہ ان ہی اقتضاآت کا خارج میں (بہ فعلیتِ خالق) ظہور ہو رہا ہے لہذا ذاتِ شی پر کوئی جبر واقع نہیں ہو رہا ہے۔ اور اسی معنی میں وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

شیخ اکبر نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا تھا کہ

"ان الحق لایعطی الا ما اعطاہ عینہ" حق تعالیٰ شی کو وہی عطا فرماتے ہیں جو اسکے عین (یعنی مفہوم) کا تقاضا ہے۔

اقبال اسی چیز کو دوسرے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے　(بال جبریل)

انسان اس معنی میں مجبور نہیں کہ اسکی "قابلیات" بھی تخلیقِ الٰہی قرار دئیے جائیں۔ انسان کی فطرت یا ماہیت بالفاظ دیگر اسکا "عین" (معلوم الٰہی ہونیکی وجہ سے جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے) غیر مخلوق ہے اور اسی لئے اسکو اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ اپنے الفاظ میں شاید اقبالؔ اسی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اسمیں　　ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی　(بال جبریل)

حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ وحکمتِ بالغہ کا لحاظ کرتے ہوئے جنکا اقبالؔ دل وجان سے قائل ہے اس شعر کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو ہم نے پیش کی ہے؟ آزادی اور اختیار کے اس مفہوم کے ساتھ جبر کا وہ مفہوم بھی یاد رکھو جو اقبالؔ نے "ہمہ از وست" کے معنی میں لیا ہے اور تخلیق کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب کی ہے تو تمہیں اس تضاد کی تلفیق سمجھ میں آنے لگتی ہے جسکو ہم نے دو جملوں میں ادا کیا ہے "الخلق من الحق والکسب من الخلق" یہی معنی ہیں اس مشہور قول کے جو امام جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

"لا جبر ولا قدر بل الامر بین الامرین" یہاں نہ جبر ہے اور نہ قدر بلکہ معاملہ دونوں کے درمیان میں ہے۔

بشنو سخن مشکل وسرِ مغلق!　　ہر فعل وصفت کہ باشد باعیان ملحق

از یکجہت آں جملہ مضاف است بما　　از وجہِ دیگر جملہ مضاف است بحق　(جامی)

اگر آپ نے سرِ قدر کو سمجھ لیا ہے تو آپکی سمجھ میں یہ بھی آجائیگا کہ کیوں "کاملین" جبر کے معنی "تخلیق من اللہ" لیکر ایکقسم کی قوت و طمانیت محسوس کرتے ہیں اور کیوں جاہل جبر کو سلبِ آزادی سمجھکر ضیق میں گرفتار ہو کر اباحت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قاضی محمود بحری کے انہیں نفیس اشعار میں سے ایک شعر اقبالؔ اپنے مکالمہ میں پیر کی زبانی کہلواتے ہیں

"جبر باشد پر و بالِ کاملاں!　　جبر ہم زندان و بند جاہلاں!

بالِ بازاں را سوئے سلطاں برد　　بالِ زاغاں را بگورستاں برد"

© rasailojaraid.com